حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

شرعی قوانین، اضطراب و تذبذب

اعتقادی اور عملی نفاق

اس وقت جب کہ شریعت بل کی شکل میں شرعی قوانین کے نفاذ کی جنگ لڑ رہے ہیں مخالف قوتیں اور حکومت ان قوانین کے بارہ میں ٹال مٹول، پس و پیش، لیت و لعل اور تذبذب و ارتیابی کیفیت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ذیل میں داعی کبیر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا فکر انگیز خطبۂ صدارت پیش خدمت ہے جس میں مولانا نے مرض کی اصل جڑ نفاق کی نشاندہی کی ہے جو مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتویں اجلاس منعقدہ ممبئی میں پڑھا گیا۔ ملکی حالات، سیاسی اور انقلابی ترجیحات، اخلاقی و جمہوری تقاضوں کی تکمیل اور ملک کی فکری و انتظامی قیادت اور ارباب فکر و بصیرت کے لئے اس میں فکر و تدبر اور ہدایت و راہ نمائی کے واضح نشان راہ موجود ہیں۔ (ادارہ)

حضرات!

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنا خطبہ دو بیش قیمت تاریخی، فکر انگیز اقتباسات سے شروع کروں۔ جو ہمارے ملک کے سیاسی و انقلابی، اصولی و اخلاقی اور جمہوری و سیاسی تاریخ میں سنگ میل اور روشنی کے میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے اس ملک کی سیاسی، انتظامی و فکری قیادت اور عوام کو ہمیشہ روشنی و رہنمائی حاصل کرنی چاہیے اور کبھی ان کو فراموش اور نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

پہلا اقتباس جنگ آزادی کے نہ صرف معتبر و مستند بلکہ قابل فخر و مایۂ ناز قائد و محسن مولانا ابوالکلام آزاد کے اس خطبۂ صدارت کا ہے جو انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء میں دیا تھا۔

مولانا نے فرمایا:

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس

کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم۔ اسلام کی تاریخ۔ اسلام کے علوم و فنون اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔

لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری راہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں میں اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

دوسرا اقتباس ملک کے مشہور دانشور، محب وطن، بین الاقوامی شہرت کے حامل، ماہر تعلیم اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم کے اس خطبہ کا ہے جو موصوف نے کاشی ودیا پیٹھ (بنارس) کے جلسہ تقسیم اسناد میں ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء کو پڑھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خودغرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر راضی نہیں اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔"

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما گلستاں میرد اگر میریم ما

حضرات!

ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی و عائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں اس حقیقت کے نہ صرف اعتراف بلکہ احترام کا اس خصوصیت کے نہ صرف باقی رہنے کی اجازت بلکہ اس کے تحفظ و ترقی اور اس کے ساتھ بقائے باہم اور مشترک ملکی اور قومی مفادات میں سرگرم اشتراک و تعاون کا ثبوت دیا ہے۔ اور جس ملک کے لئے غیر مذہبی (SECULAR) اور جمہوری طرز حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانبداری اور ذہن و ضمیر کی صفائی کے ساتھ) سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابل قبول نظام ہوسکتا ہے۔ یہی طرز فکر مناسب ہے، اور یہ نہ صرف کہنے والوں کی اپنے اپنے ایمان و عقیدہ اور قلب و ضمیر کی صحیح ترجمانی ہے۔ بلکہ حقیقت پسندی، سچی الوطنی اقوام و ملل، تمدنوں و تہذیبوں اور علوم و فلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ اور کہنے والوں کی بلند نگاہی، روشن ضمیری، اصول پسندی اور اسی کے ساتھ اس اخلاقی جرأت کا نمونہ و مظاہرہ بھی ہے جو ان دونوں قائدین فکر و سیاست کے ہر طرح شایانِ شان ہے۔

اس حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کے مختلف فرقوں، آبادی کے مختلف النوع عناصر اور اقلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب و عقائد، اپنے تمدنوں و تہذیبوں اور اپنے معاشرتی و عائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت و دفاع میں صرف کرنے کے بجائے ملک کی تعمیر و ترقی اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزت و مفاد کے کام پر مرکوز رکھنے کے لئے دستور ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے اور جس میں ہندوستانی شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ اس کے دستور کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"امن عامہ، اخلاق اور صحت اور نیز اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے

تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور آزادانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے اور تبلیغ و اشاعت کا یکساں حق ہوگا۔

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی و تمدنی، تہذیبی، مذہبی و نفسیاتی صورت حال کے عین مطابق تھی اور اس پر پوری دیانت داری، خلوص اور عزم و فیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی۔

لیکن اس قابلِ تعریف دستور ہند کا جس میں ملک کے ماہرین قانون اور دستور سازوں کی بہترین ذہنی، قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں جس نے بہت وقت لیا اور جس کے ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئیں۔ یہ عجیب و غریب تضاد بلکہ دنیا کی دستور سازی کی تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ اس کے بعد ہی دفعہ ۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) کی دفعہ شامل کی گئی اور اس کو دستور ہند کے رہنما اصول -DIRECTIVE (PRINCIPLE) کا درجہ دیا گیا۔ اس دستور کا متن حسب ذیل ہے۔

مملکت ہندوستان کے پورے قلمرو شہریوں کے لئے یکساں
مدنی ضابطہ (UNIFORM CIVIL CODE) کے حصول کی سعی کرے گی۔

جس وقت دستور کی ترتیب عمل میں آئی تھی اس وقت مسلم زعماء کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ دستور ہند کے بنیادی حقوق (FUNDAMENTAL RIGHTS) کی دفعات کے ذریعے مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا ہے اور بنیادی حقوق کی دفعات رہنما اصول سے زیادہ اہم ہیں۔ لیکن دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جہاں تک مسلمانوں کے عائلی قوانین اور نظام معاشرت کا تعلق ہے (جو ان کے مذہب کا جزء لاینفک ہے (INSEPARABLE PART) دستور ہند کے اس نارد پوڈ میں ایک آتش گیر (EXPLOSIVE MATTER) مادہ رکھ دیا گیا ہے جو کسی وقت بھی کسی ادنیٰ تحریک یا باہر کی گرم ہواؤں کے اثر سے آگ پکڑ سکتا ہے اور ان مذہبی و قانونی تحفظات کو جلا کر فنا کر سکتا ہے جن کی دستور نے ضمانت دی تھی۔ چنانچہ واقعات کی قدرتی رفتار اور ان مختلف عوامل و محرکات (FACTORS) کے باعث جن کا تعلق مسلمانوں کے لئے عائلی قوانین (PERSONAL LAW) کی صحیح نوعیت اور اس کے ان کے مذہب سے تعلق اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے عقائد و جذبات اور نفسیات سے ناواقفیت، فکر و نظر کی سطحیت سے بھی ہے اور ہندو احیائیت (HINDU REVIVALISM) کے جذبہ اور سیاسی و انتخابی مصالح اور اکثریت کے خوش کرنے کے جذبہ سے بھی ہو سکتا ہے یہ خطرہ سامنے آگیا اور ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد ۱۹۷۲ء میں مختلف اسباب و محرکات کی بناء پر ہندوستان میں مختلف فرقوں کے عائلی قوانین (پرسنل لا) کی وحدت اور مسلم پرسنل لا کی اصلاح و ترمیم کی ایک بار پھر بلند آہنگی کے ساتھ آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ مختلف وقتوں میں مجلس قانون ساز کے اندر اور مجلس قانون ساز کے باہر بلند ہوتی رہی۔ لیکن مختلف سیاسی مصلحتوں سے اور مسلم رائے عامہ کی برہمی کے خوف سے (جس کا ایکشن پر بھی اثر پڑنے کا خطرہ تھا) دبائی جاتی رہی اور حکومت ہند نے کئی بار اپنے اعلیٰ ذمہ داروں کی زبان سے اس کا اعلان کیا کہ ہمارا نے کی اس کی کوئی نیت نہیں ہے۔ اور جب تک متعلق فرقے خود اس خواہش کا اظہار اور اس کا مطالبہ نہ کریں اس کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اسی کے ساتھ خود ان فرقوں کے متعدد افراد پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر یہ آواز اٹھاتے رہے اور بعض دور بین نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ محض ان کے ضمیر کی آواز نہیں ہے بلکہ ان کی زبان حال کہتی ہے کہ ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہمہ می گویم

حقیقت جو کچھ بھی ہو اتنا اندازہ ہو گیا کہ ملک کے قانون سازوں اور ارباب اختیار کے ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہیں۔ اور کسی وقت بھی خاکستر کے نیچے یہ چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں۔

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک ہیں ایک یہ کہ "سلطانیٔ جمہور" کے اس دور میں قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے۔ اور عائلی قوانین زندگی کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط بھی رکھتا ہے۔ جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں "آسمانی قانون" کا کوئی تخیل یا عقیدہ نہیں ہے اور وہ عائلی قوانین کو محض زندگی کے تجربات کا نتیجہ اور خواہشات و ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور بدقسمتی سے دو بڑے آسمانی مذہبوں اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی قوموں اور فرقوں بالخصوص آریائی نسلوں میں یہی تخیل پایا جاتا ہے۔ ان قوموں اور فرقوں میں اس قانون میں حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل قدرتی امر و بدیہی حقیقت ہے اس لئے کہ وہ انسانوں ہی کے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ زمانہ بدل جانے اور حالات تبدیل ہو جانے سے انسانوں ہی کے ہاتھوں میں اصلاح و ترمیم اور تبدیلی نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات فرض و واجب ہو جاتی ہے۔

دوسرا بڑا محرک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزا میں زیادہ ہمہ رنگی و وحدت (UNIFORMITY) کا وہ عالمگیر رجحان ہے جس کا تقریباً اس صدی کے اوائل سے بڑی قوت و شدت کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا گیا اور اس میں ادب و شاعری، علم و سیاست اور صحافت و خطابت سب نے پورا حصہ لیا ہے۔ یورپ سے (جہاں کے اکثر ملکوں میں ایک ہی تہذیب، ایک ہی معاشرتی نظام ایک ہی عائلی قوانین اور اکثر ایک ہی مذہب اور زبان رائج ہے۔) یہ خیال ان مشرقی و ایشیائی ممالک میں آیا۔ جہاں کئی کئی مذہب، تہذیبیں اور مختلف معاشرتی نظام کبھی بھی باہمی نفرت و زور آزمائی اور انتشار کا باعث نہیں ہوئے۔ انتشار و افتراق کا اصل سبب ہمیشہ ملکوں کے سیاسی اغراض و قوموں کے سیاسی رہنماؤں کے ذاتی مفادات ثابت ہوا ہے۔ خود یورپ میں مکمل مذہبی تہذیبی اور عائلی وحدت کے باوجود دو خون آشام جنگیں ہو چکیں۔ جن کے شعلوں سے مشرق و ایشیا کا دامن بھی نہیں بچ سکا۔ پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً و ابتداً برطانیہ و جرمنی کے درمیان ہوئی تھی جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ مسیحی ہیں بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں۔ اور ان کا عائلی قوانین و معاشرت تقریباً ایک ہے۔ پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے۔ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہیے تھا۔ پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ آپ عدالتوں میں کبھی جا کر دیکھ آئیے کہ مسلمان مدعی ہے اور مدعا علیہ مسلمان۔ مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے۔ تو دونوں کا عائلی قوانین بھی ایک ہے۔ بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے دونوں فریق ایک نسل اور ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے۔ کہ اس میں بھی عائلی قوانین کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی اور ایک دوسرے

کے خلاف محافہ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت اور دولت پرستی کے جنون سے اور حد سے بڑھی مادیت سے ہے۔ اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قوانین ایک ہوجانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا۔ پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یہ نظام سول کوڈ ہونا چاہیئے تاکہ آپس میں اتحاد و الفت پیدا ہو۔ طوطے کی طرح اس بات کو دہرانے رہنا سطحیت مرعوبیت اور اندھی تقلید کی ایک مثال ہے۔

ان دو محرکات کے ساتھ (معذرت کے ساتھ) یہ بھی اضافہ کرنا پڑتا ہے کہ بعض فرقوں کے عائلی قوانین میں ایسی ناہمواریاں اور نقائص پائے جاتے ہیں۔ (اور ایسا مخلص سے مخلص اور لائق سے لائق انسان قانون سازوں کے بنائے ہوئے قوانین میں بھی ہونا ضروری ہے) کہ ان کی اصلاح اور جدید حالات کے مطابق نئے قوانین کا وضع کرنا ایک رفاہی جمہوری (WELFARE DEMOCRATIC) حکومت کا بھی فرض ہے اور اس فرقہ کے فرض شناس اور حقیقت پسند رہنماؤں اور نمائندوں کا بھی اس لئے ہمیں اس معاملہ میں (جہاں تک ان فرقوں کا تعلق ہے) نہ ملامت کا حق ہے اور نہ احتجاج کا۔

لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، صورت حال اس سے قطعاً مختلف ہے ان کے ایمان و عقیدہ کا جز ہے کہ ان کا عائلی قانون (FAMILY LAW) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد و عبادات کا قانون عطا کیا سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے۔ مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں۔ اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم و خبیر کا بنایا ہوا ہے جو انسان کا بھی خالق ہے۔ اور اس کائنات کا بھی اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں سے واقف ہے وہ فرماتا ہے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (سورہ ملک)

کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو بڑا ہی باریک بین اور (پورا) باخبر ہے۔

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے۔ ہمارے لحاظ سے ماضی حال مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہے اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے۔ اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی و عملی نفاق کے سوا کچھ نہیں۔ پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں۔ اس قانون کے مکمل متوازن اور عادل ہونے اور زمان و مکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے عقلی و علمی شواہد اور مسلم و غیر مسلم، مشرقی و مغربی فضلاء، جری و انصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور علمی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی شپرہ چشم ہی ان سے انکار کر سکتا ہے۔ اس موضوع پر

نامور فضلاء نے قدم اٹھایا ہے وہ بڑا قیمتی ہے۔

ہندوستان میں جب یہ مسئلہ اٹھا اور دیکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ افق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگئی ہیں اور یہ بادل جو ابھی کسی وقت گرجتا ہے کسی وقت ضرور برسے گا۔ تو انہوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے ۱۹۷۲ء میں ممبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رخ کا جائزہ لیا جاتا رہے اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہے۔ تاکہ اچانک ان پر یہ آگ کی دوسرا مسئلہ شبخون نہ مارنے پائے۔ یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور مسلم پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رخ معلوم ہوگیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فی صد متفق ہیں۔ اس لئے دانشمندی حقیقت پسندی اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضا ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

یہ صورت حال قائم تھی اور یہ مسلمان اقلیت اور اس معاشرہ و ماحول کے دریا کی سطح ساکن تھی کہ ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں نفقۂ مطلقہ کے بارے میں وہ ہنگامہ خیز فیصلہ دیا جس سے ملت اسلامی مسلم معاشرہ اور علماء و دانشوروں اور مسلم ماہرین قانون کے حلقہ میں ایک ایسا تلاطم اور طوفانی کیفیت پیدا ہوئی جس کی نظیر اپنی وسعت و عمومیت، شدت احساس بلکہ اذیت و کرب کے لحاظ سے عظیم فرقہ وارانہ فسادات خون ریزی اور انسان سوزی کے لرزہ خیز واقعات کی موجودگی میں بھی نہیں ملتی۔ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے تہذیبی معاشرتی ارتداد، شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور

وَمَن لَّم يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (مائدہ ۴۴)

جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا۔ اور اس سے غیر مسلم جج صاحبان یا قرآن و تفسیر فقہ، اصول فقہ اور عربی زبان میں مہارت خصوصی نہ رکھنے والے مسلمان ججوں کے لئے قرآنی آیات۔ اس کے الفاظ و اصطلاحات کی دوسری زبانوں کے ترجمہ کی مدد، سکنڈ ہینڈ معلومات، سطحی اور عاجلانہ مطالعہ اور بعض اوقات ترقی پسندی یا بیرونی اثرات و مؤثرات سے تاثر کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔

من مانی تفسیر اور خواہشمندانہ تشریح (WISHFUL THINKING) کا آزادانہ موقع مل سکتا ہے اور یہ نہ صرف دین و شریعت، مذہبی صحیفوں بلکہ دنیا کے دائمی عالمگیر اصول، اختصاص (SPECIALISATION) اور علوم و

فنون میں اتھارٹی کے تسلیم و احترام کے اس اصول کے خلاف تھا جو ساری علمی، فنی دنیا میں صدیوں سے تسلیم کیا جا رہا ہے اور جس پر زبان و ادب، فلسفہ، منطق، سائنس و ٹیکنالوجی، اقتصادیات و مدنیات کا نظام چل رہا ہے۔

اس موقعہ پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور ملی غیرت و خودداری کا ایسا ثبوت دیا جس کی نظیر عرصہ دراز سے ملی و دینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے جن میں بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا۔ کلکتہ کے جلسہ عام میں ۷ اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا، محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ انسان تھے۔ شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امڈ پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ترین ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں۔

اس کے بالمقابل انگریزی و ہندی پریس نے اس مسئلہ پر ایسی مخالفانہ صف آرائی (OPPOSED TOOTH AND NAIL) کا مظاہرہ کیا جس کی مثال شاید تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی اس شدت احساس اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش کی۔ اور ایک جزوی عائلی مسئلہ میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود طبقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مطلقہ خواتین) متاثر ہوتی تھی۔ کو اس نظر سے دیکھا گویا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے۔ یا کوئی ملک گیر وبا پھیلنے والی ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ اور پریس کانفرنس میں کہا ہے انہوں نے اس بارے میں اصول "احساس تناسب" (SENSE OF PROPORTION) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔" (بجارت ...)